ڈاکٹر شاہد حسن رضوی

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں علماء کا کردار: مولانا فضل حق خیر آبادی (۱۷۹۷ء-۱۸۶۱ء)

(تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ)

Ulema and Sufis played a vital role in spreading Islam in the sub-continent. During 712-1526 A.D., they remained effective in religion and politics in the sub-continent. With the passage of time, they were sidelined. However, they remained behind every movement launched for the cause of Islam. In the later part of the 20th century, Ulema once again appeared on the political scène and gave sacrifices to save the day by day deminishing Mughal rule. Especially during the War of independence 1857, their role was exemplary. This article highlights the character and achievement of the renowned scholar as well as a man of action in the 20th century Allama Fazl-i-Haq Khairabadi who not only fought for the cause but also were exiled to Andaman Islands where he died in prison.

برصغیر پاک و ہند میں اشاعتِ اسلام اولیاء و علمائے سلف کی رہینِ منت ہے۔ جن کی کوششوں سے یہاں عظیم خانقاہی نظام کی بنیاد پڑی۔ مغلوں کی آمد کے بعد یہ نظام کمزور ہوتا چلا گیا۔ اولیاء و علماء کی گوشہ نشینی میدانِ سیاست سے دوری کا باعث بنی۔ چنانچہ دورِ اکبری (۱۵۵۶ء — ۱۶۰۵ء) سے پہلے علماء کا ریاستی معاملات میں دخل نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ اکبر اعظم نے ملاؤں اور پنڈتوں کو میدانِ سیاست میں لانے کی کوششیں کیں وہ اس کے عہدِ حکومت کے آخری حصے میں دینِ الٰہی کے پس منظر میں افراط و تفریط کا شکار ہو کر رہ گئیں۔ اس طرح انیسویں صدی کے وسط تک ریاستی امور میں علماء کا عنصر کافی حد تک دبا رہا۔ اٹھارہویں صدی کا آخری اور انیسویں صدی کا ابتدائی عہد اپنے جلو میں افراتفری اور طوائف الملوکی کے عناصر لیے ہوئے تھا اور زوال، مغلیہ سلطنت کے دروازے پر مسلسل دستک دیے جا رہا تھا۔ انگریزوں کا اقتدار ملک میں قائم ہو چکا تھا۔ اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر صوبہ اور ہر ریاست بجائے خود مطلق العنان بن بیٹھے تھے۔ اس طرح تاجِ دہلی بے وقعت ہو کر رہ گیا تھا۔ بالخصوص پنجاب میں سکھا شاہی مغل اقتدار کے لیے ایک مستقل خطرہ بن کر ابھری جس سے نمٹنا جانا ضروری تھا۔ یہ خطرہ اس حد تک بڑھا کہ انگریز بھی سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے بے بس ہو کر رہ گئے۔ سکھوں کا المیہ یہ تھا کہ وہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کے ردِعمل کے طور پر مسلمانوں سے انتقام لینے پر تل گئے تھے۔ انہوں نے جگہ جگہ مسلمانوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اکثر مقامات پر سکھ فوجیوں نے جلوس سمیت مساجد میں داخل ہو کر ان کے تقدس کو پامال کیا

اور وہاں اذانوں پر پابندی لگادی۔ پنجاب میں مسلمانوں پر زیادتی کی خبریں جب برصغیر کے دیگر حصوں میں پہنچیں تو سارے برصغیر میں بے چینی اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید احمد بریلوی (۱۷۸۶ء—۱۸۳۱ء)، شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء—۱۷۶۲ء) کے فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز دہلوی کے افکار کی ترجمانی، تحریک جہاد (۱۸۲۶ء—۱۸۳۱ء) کی صورت میں کر رہے تھے(۱)۔ تحریک کے نتائج و عواقب سے قطع نظر، سید احمد بریلوی کی جہادی سرگرمیوں نے برصغیر کے علماء میں ایک نیا جوش وولولہ پیدا کردیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا موقع آیا تو علماء ایک بار پھر میدان عمل میں آ گئے۔

مسلمانان برصغیر کے سیاسی اضمحلال کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) سے ہوا۔ اورنگ زیب کے جانشین اس اہل نہ تھے کہ وہ برصغیر کی وسیع و عریض سلطنت کو سنبھال سکتے(۲)۔ ذرائع مواصلات کی عدم موجودگی میں، ریاستی اکائیوں کو متحد رکھنے کا واحد حل فوجی طاقت کا استعمال تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مغل فوج کے انتظام و انصرام میں بھی ابتری در آئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرکز سے دور افتادہ صوبوں میں گورنروں نے خود مختاری کا اعلان کردیا۔ مزید یہ کہ انگریزوں نے ریاستوں کے اندرونی انتشار اور باہمی چپقلش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، خود کو سیاسی طور پر بھی مضبوط کرنا شروع کردیا۔(۳)

جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) جنگ بکسر (۱۷۶۴ء)، سقوط میسور (۱۷۹۹ء) اور سقوط دہلی (۱۸۵۷ء) انگریزوں کی سیاسی چالبازیوں اور دجل و فریب کے نمایاں مظاہر تھے۔ لیکن برصغیر پاک و ہند کے حکمران انگریزوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند نہ باندھ سکے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے کاروبار زندگی کو اپنے وضع کردہ اصول و ضوابط کی روشنی میں بلا تردد چلانا شروع کردیا(۴)۔ مغل بادشاہوں نے کمپنی کی وظیفہ خواری میں عافیت ڈھونڈی، مگر برصغیر کے غیور عوام، انگریزی اقتدار سے نالاں تھے، انگریزوں کی من مانیوں اور معاشی استحصال نے بالآخر ایک حوالہ لکھی کی صورت اختیار کر لی جو جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کی صورت اختیار کر گیا۔(۵)

جنگ آزادی میں ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد نے حصہ لیا۔ تاہم جن افراد نے تاریخ کے اوراق میں جگہ پائی ان میں طبقہ علماء سرفہرست ہے۔ علماء میں مولوی احمد اللہ شاہ، مولوی فیض احمد بدایونی، مولانا کفایت علی کافی، مولوی سید فضل حق شاہجہان پوری، مولوی قطب شاہ بریلوی، مولوی عبدالقادر لدھیانوی، مولوی حکیم سعید اللہ قادری، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولوی ابوالحسن فرنگی علی، مولانا تراب علی لکھنوی اور مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں(۶)۔ تاہم ان تمام شخصیات میں جس عالم دین نے عالمگیر شہرت پائی وہ مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔

مولانا فضل حق خیرآبادی، ۱۷۹۷ء میں صوبہ اودھ کے مشہور قصبہ خیرآباد میں مولانا فضل امام کے ہاں پیدا ہوئے(۷)۔ جو ایک متبحر عالم دین تھے۔ ان کے والد دہلی کے صدر الصدور کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ تیئیس واسطوں سے علامہ فضل حق کا سلسلہ نسب خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ بہت ذکی اور فطین تھے۔ محض تیرہ برس کی عمر میں علوم دینی و دنیوی سے فراغت حاصل کر لی۔ چار مہینوں میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ معقولات کی تعلیم اپنے والد بزرگوار جبکہ منقولات میں شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز سے کسب علم کیا(۸)۔ ۲۸ برس کی عمر میں والد ماجد کی وفات کے بعد دہلی میں سررشتہ دار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ بعد ازاں لکھنؤ کے صدر الصدور بنا کر بھیجے گئے مگر انگریزی ملازمت ان کی افتاد طبع کے خلاف تھی۔ چنانچہ استعفیٰ دے کر نواب فیض محمد خاں والیٔ جھجر کی ملازمت اختیار کر لی(۹)۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد مہاراجہ الور اور پھر نواب آف ٹونک کے پاس رہے۔ یہاں بھی زیادہ عرصہ نہیں ٹکے اور رامپور چلے گئے جہاں نواب یوسف علی خان نے اتالیقی کے ساتھ ساتھ محکمہ نظامت ان کے حوالے کردیا۔ اپنے ہم عصر علماء کی روایت کے برخلاف مولانا فضل حق خیرآبادی کو سخن فہمی اور سخن گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ عربی اور فارسی میں اشعار کہتے تھے۔ فارسی میں فرقتی تخلص کرتے تھے۔ شعر و شاعری میں اسی دلچسپی کی بدولت ان کے غالب سے بہت اچھے اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ بلکہ یہاں تک کہ غالب نے انہی کے ایماء پر سہل

انگاری کی ابتدا کی (۱۰)۔ غالب کے علاوہ ان کے امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، ذوق، مفتی صدرالدین آزردہ اور ولی عہد سلطنت بہادر شاہ ظفر سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ دہلی کے قیام کے دوران مولانا فضل حق اور مفتی صدرالدین آزردہ کی رہائش گاہیں، علماء و شعراء کی نشستگاہیں تھیں۔ (۱۱)

مولانا فضل حق خیرآبادی کا عہد مسلمانوں کے زوال کا عہد تھا۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ مسلمان جہالت و غفلت میں مبتلا تھے۔ انگریزوں کا ظلم روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ہندوستان کو دارالحرب قرار دے چکے تھے۔ ہندو اور انگریز مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ہندوؤں کی طرف سے ہندو مان گڑھی کی مسجد میں مسلمانوں کو داخلے کی اجازت نہ دینے سے پیش آنے والے حادثہ (۱۸۵۵ء) اور انگریز مشنریوں کی تبلیغ عیسائیت نے مولانا کو ہندو اور انگریز دونوں سے متنفر کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ چھوڑ کر الور کی راہ لی۔ (۱۲)

مولانا نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جو حصہ لیا وہ کسی وقتی جوش اور جذبے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ جنگ آزادی برپا ہونے سے برسوں پہلے وہ برصغیر پر انگریزی تسلط فرنگی حکام کی مست شعاری سے بددل و بیزار تھے۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی (۱۶۰۰—۱۸۵۷ء) کی ملازمت ہی سے کیا مگر ملازمت ناپسند ہونے کے باوجود اپنے والد گرامی کے حکم پر صاد کیا۔ ملازمت کے تین چار سال بعد ہی والد ماجد کے نام اپنے ایک مکتوب میں اس ملازمت سے بےزاری کا اظہار یوں فرمایا (ترجمہ):

> ''میں خدا کے فضل و کرم سے خوش حال اور مطمئن ہوں مگر ملازمت میں ذلت و خواری بہت ہے۔ حاکم کے سامنے مستقل حاضر رہنا پڑتا اور اس کے وہ احکام املاء کرنا ہوتے ہیں جو قابل قبول نہیں ہوتے۔ قسم خدا کی اگر مجھے رسوائی کی شرم نہ ہوتی تو کبھی کا کہیں اور منتقل ہوجاتا اور متوکلانہ زندگی بسر کرتا۔'' (۱۳)

تاہم انہوں نے والد ماجد کی وفات کے فوراً بعد ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ آپ انگریز حاکم کے ظالمانہ احکام و اقدامات اور اس سے عوام پر پڑنے والی افتاد کا بھی جائزہ لیتے رہے اور ان کی تکالیف اور پریشانیوں کے ازالہ کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہے۔ مثل حاکم اگرچہ انگریزی حق مانیوں کے آگے بےبس تھے تاہم مولانا نے انگریز کے بجائے برصغیر کے مسلمان زعماء کو جگانا مناسب سمجھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اکبر شاہ ثانی کو ایک طویل خط لکھا جس میں انگریزوں کی چالبازیوں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی المناک صورتحال پر خاصی روشنی ڈالی گئی تھی:۔

> ''یہاں کے باشندے ہندو ہوں یا مسلمان، تجارت، زراعت، حرفت، زمینداری اور درویزہ گری پر معاش رکھتے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد سے معاش کے یہ تمام وسائل مسدود و منقود ہوگئے ہیں۔ ملازمت کے دروازے شہریوں پر بند ہیں۔ تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا ہے۔ کپڑا، سوت، ظروف اور گھوڑے وغیرہ تک وہ فرنگ سے لے کر خود فروخت کر کے نفع کماتے ہیں۔'' (۱۴)

مولانا کے نزدیک انگریز مسلمانوں کو معاشی طور پر مفلوج کر کے ان کی دینی غیرت و حمیت کو ختم کردینا چاہتے تھے۔ مولانا نے انگریز کی انہی پالیسیوں کو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی اہم وجہ بتایا ہے۔ تحریک آزادی کے اسباب و عوامل کو ''الثورۃ الہندیہ'' میں اس طرح بیان فرمایا:

> ''(۱) انگریزوں نے بچوں کو اپنا دین اور اپنی زبان سکھانے کے لیے جگہ جگہ اسکول کھولے اور دینی

مدارس کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔

(۲) ملک کی تمام پیداوار خرید لیتے اور پھر غلے کی قیمت اور سپلائی پر اجارہ داری قائم کر لیتے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ خلق خدا ہماری دست نگر ہو جائے اور بے چون و چرا ہمارے احکام کی تعمیل کرے۔

(۳) شعائر اسلامی کو روکنے کی بھرپور کوشش کی بالخصوص خواتین کا پردہ ختم کرانے کی کوشش کی۔

(۴) مسلمان فوجوں کو سور کی چربی والے اور ہندوؤں کو گائے کی چربی والے کارتوس دیئے گئے جو منہ سے کاٹنے پڑتے تھے۔'' (۱۵)

ان کی تحریروں میں انگریز سے نفرت روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ فتنۃ الہند میں یہاں تک فرماتے ہیں:

''اس قرآنی سے ثابت ہے کہ ان کی (انگریزوں) کی محبت کفر ہے۔ کسی حق پرست انسان کو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ نصاریٰ سے محبت کس طرح جائز ہو سکتی ہے جب کہ یہ لوگ اس ذات اقدس ﷺ کے دشمن ہیں جن کے طفیل ارض و سما پیدا کیے گئے۔'' (۱۶)

مولانا کے انگریزوں کے متعلق یہ جذبات صرف جذبہ وطنیت پر مبنی نہیں تھے۔ وہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط کے اس لیے مخالف نہیں تھے کہ انگریز غیر ملکی تھے بلکہ اس کی بنا مذہب پر ہے جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے بھی ظاہر ہے۔ ان کو غم انگریزوں کے قبضے کا نہیں تھا بلکہ نصاریٰ کے قبضے کا تھا اور نصاریٰ سے تعلق شرعاً ممنوع ہے۔ (۱۷)

مولانا یہ بھی محسوس کر رہے تھے۔ کہ انگریزوں کی نظر میں ملک پر ان کے ہمہ گیر تسلط اور ان کی حکومت کے استحکام کے لیے اس ملک کے تمام باشندوں کا صرف ایک مذہب (یعنی عیسائیت) ہونا ضروری ہے اور اس سلسلے میں وہ نظام تعلیم تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ سکولوں کا جال بچھاتے چلے جا رہے تھے۔ رئیس احمد جعفری کے بقول:

''فضل حق خیر آبادی انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے ہر منظم اور باقاعدہ تحریک میں حصہ لینے پر دل و جان سے آمادہ رہتے تھے۔ چنانچہ جب غدر (جنگ آزادی) شروع ہوا تو مولانا بے تامل شریک ہو گئے۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے معتمد، مقرب اور مشیر تھے۔ ان کے دربار میں شریک ہوا کرتے تھے، انہیں اہم مسائل و معاملات پر مشورے دیتے تھے اور اس بات کے ساعی تھے کہ آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہو اور انگریز اس دیس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے۔ مولانا نے غدر میں دلیری اور جرأت کے ساتھ اعلانیہ حصہ لیا۔ انہوں نے متعدد والیان ریاست اور امرائے ہند کو اس تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ جس جس والیٔ ریاست سے ان کے ذاتی تعلقات اور مراسم تھے، ان کی تائید اور حمایت حاصل کی اور مالی امداد کے لیے مجبور کیا۔'' (۱۸)

انہوں نے ایک طرف نہ صرف انگریز کے خلاف اعلان جہاد کیا بلکہ جہاد کی تبلیغ کر کے لوگوں کو جہاد میں شامل کیا۔ حتیٰ کہ بہادر شاہ ظفر کو مرکزی حیثیت سنبھال کر تحریک آزادی کی قیادت کے لیے تیار کیا (۱۹)۔ عیش و عشرت اور فسق و فجور میں غرق شہزادوں کو ان کے خوفناک انجام سے آگاہ کیا۔ مختلف علاقوں سے مجاہدین آزادی کے دستوں کے درمیان ربط و ضبط اور مرکزیت پیدا کی۔ ہندوؤں کی معاونت کے حصول کے لیے ایک شاہی فرمان کے ذریعے گاؤکشی بند کر دی گئی (۲۰)۔ مرکز میں ایک سیکریٹریٹ قائم کر کے مجاہدین کی اعانت کے لیے سامان رسد کی فراہمی اور مالی امداد کا بندوبست کیا گیا۔ ان اقدامات کے ساتھ ساتھ مولانا نے تحریک آزادی کا ایک جامع دستور بھی مرتب کیا۔ اس دستور کی بنیاد جمہوری اصولوں پر رکھی گئی تھی

یعنی رعایا کو کاروبارِ سلطنت میں شریک کرنے کے لیے دفعات مرتب کی گئی تھیں۔(۲۱)

تحریک آزادی میں مولانا فضل الحق خیرآبادی کا بھرپور اور نمایاں کردار اس وقت ہمارے سامنے آتا ہے جب انہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد جاری کیا۔اس فتویٰ پر اس وقت کے ممتاز علمائے دین مفتی صدرالدین خان آزردہ، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خان اکبرآبادی اور سید مبارک حسین رام پوری نے دستخط کر دیے(۲۲)۔فتویٰ کے اجراء نے عوام میں جوش وخروش کو مزید بڑھا دیا۔دوسری طرف انگریزوں نے بھی ظلم کی انتہا کر دی۔ زندہ مسلمانوں کو سؤر کی کھال میں سلوا کر جلتے تیل میں ڈالا گیا۔فتح پوری مسجد سے لال قلعہ کے دروازے تک مسلمانوں کی لاشوں کو درختوں سے لٹکایا گیا۔مساجد کی بے حرمتی کی گئی جامع مسجد دہلی کے حجروں میں گھوڑوں کو باندھا گیا۔(۲۳)

جب دہلی شہر پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوگیا تو انگریزوں نے مسلمانوں کا غلہ اور پانی بند کر دیا۔ان حالات میں علامہ فضل حق پانچ روز تک بھوکے پیاسے مکان میں بند رہے اور بعد ازاں بھیکن پور ضلع علی گڑھ چلے گئے اور پھر وہاں سے بریلی چلے گئے اور وہاں روپوش رہے۔بعض کے نزدیک قریباً تیس دن یہاں رہنے کے بعد آپ اپنے آبائی شہر خیرآباد چلے گئے۔(۲۴)

ادھر جنرل بخت خان لکھنؤ پہنچ کر احمد اللہ شاہ دلدار جنگ سے جا ملے اور انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔لیکن شکست کھا کر شاہ جہاں پور گئے اور پھر محمد پوری میں اسلامی حکومت قائم کر لی۔نانا صاحب پیشوا، مولوی عظیم اللہ کانپوری اور شہزادہ فیروز شاہ وغیرہ نے بھی جنرل بخت خاں کا ساتھ دیا مگر وسائل اور افرادی قوت کی کمی آڑے آئی اور مجاہدین کو شکست ہوئی۔(۲۵)

سقوطِ دہلی کے باوجود ملکہ اودھ حضرت محل نے نہایت جرأت کا مظاہرہ کیا۔بھاگ کر آنے والوں کو پناہ دی اور اپنی فوج کو مختلف علاقوں کا انتظام کرنے اور دریا کے گھاٹوں کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا۔علامہ فضل حق بھی بھیکن سے خیرآباد پہنچ چکے تھے۔لہٰذا ملکہ کی پارلیمنٹ میں بطور مشیر خاص شریک ہوئے اور اہم کردار ادا کیا۔(۲۶)

علامہ فضل حق خیرآبادی نے جنگِ آزادی کا حال اپنی کتاب ''ثورۃ الہند'' یعنی باغی ہندوستان میں تفصیلاً بیان کیا ہے:

> ''نصاریٰ جب لڑتے لڑتے تھک گئے تو ہندوؤں سے مدد اور معاونت کے طالب ہوئے۔ ہندوؤں نے کثیر لشکر اور ساز وسامان حرب سے تھوڑی سی مدت میں ان کی پے در پے مدد کی۔تب نصاریٰ نے سخت لڑائی ٹھان دی۔
>
> چار مہینے تک متواتر جنگ ہوتی رہی۔مگر دشمن کثیر لاؤلشکر اور ساز وسامان کے باوجود شہر میں داخل نہ ہو سکا۔۔۔آخر مجاہدین کی ایک مختصر سی جماعت رہ گئی۔جو بھوک، پیاس برداشت کر کے رات گزارتی اور صبح ہوتے ہی مقابلہ پر ڈٹ جاتی۔۔۔بدقسمتی سے ایک شب محاذ پر بزدل اور کسل مند جماعت مقرر کر دی گئی جو ہتھیار اتار کر آرام کی نیند سو گئی۔دشمن نے موقع غنیمت سمجھ کر شب خون مارا اور ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کر کے انہیں موت کی نیند سلا دیا۔
>
> جب نصاریٰ نے اس محاذ پر قبضہ کر لیا تو بہت سی توپیں اور منجنیقیں شہر کے قریب نصب کر دیں اور دن رات گولیوں کا مینہ برسانا شروع کر دیا۔جس سے شہر پناہ کا چھاتک گر پڑا اور امیدوں کے رشتے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔۔۔
>
> ۔۔۔اب ڈیوں اور دوسرے ہندوؤں نے جو نصاریٰ کے دوست تھے، اپنا غلہ چھپا لیا اور باہر سے آنے والے غلہ کی آمد روک دی گئی۔نتیجہ یہ ہوا کہ لشکری اور شہری بھوک سے پریشان ہو کر شہر سے بھاگ گئے اور دشمن نے شہر پناہ، لال قلعہ بازار اور مکانوں پر قبضہ جما لیا۔''(۲۷)

مولانا فضل حق کے بقول ہندوستان پر اپنا تسلط مکمل کر لینے کے بعد انگریز نے بقائے اقتدار کے لیے دو اہم

اسکیمیں متعارف کرائیں:

(۱) سابقہ علوم اور مدارس ومکاتب مٹانے کے بعد اسکولوں کی یکساں تعلیم کا رواج جس سے ہر مذہب وملت کے افراد ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں۔

(۲) معاش پر کنٹرول کر کے عوام کو زیر تسلط لایا جائے۔(۲۸)

ان کے الفاظ میں:

''انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر فرقوں کا اختلاف تسلط وقبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا اس لیے پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ مذہب وملت کے مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر وحیلہ سے کام لینا شروع کر دیا۔ اس نے بچوں اور نا سمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان ومذہب کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے۔ پچھلے زمانہ کے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔
دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقات پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمین ہند کے غلہ کی پیداوار کاشتکاروں سے لے کر نقد دام ادا کیے جائیں اور ان غریبوں کو خرید وفروخت کا کوئی اختیار نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح نرخ کے گھٹانے بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی مخلوق، مجبور ومعذور ہو کر ان کے قدموں میں آ گرے اور خوراک وغیرہ کے نہ ملنے پر ان کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔''(۲۹)

پہلے مقصد کے حصول کے لیے لارڈ میکالے جیسے گرگ جہاندیدہ کو آگے بڑھایا گیا جس نے ۱۸۳۵ء میں ایسا نظام تعلیم دیا جس کے خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی مگر عادات واطوار اور زبان ومزاج کے لحاظ سے انگریز تیار کیے جانے لگے۔(۳۰)

مولانا فضل حق نے حادثہ بالاکوٹ، واقعہ ہنومان گڑھی، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی بے بسی، والیٔ اودھ نواب واجد علی شاہ کی معزولی، دہلی اور لکھنؤ کی بربادی کو چشم عبرت سے دیکھا تو دوسری طرف عملاً حکومت کے مظالم پر افسوس کا اظہار کیا جو ہندوستانی تہذیب وکلچر اور مذہب کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کلکتہ کے پادری ای ایڈمنڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

''برٹش راج میں تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی ہے۔ تاربرقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی ہے۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہوگئی۔ مذہب بھی ایک چاہیے، اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔''(۳۱)

اس وقت کے ہندوستان کے حالات ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے انتہائی حد تک ناموافق ہو چکے تھے۔ ان حالات میں سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ہندوستان کو بزور بازو دارالکفر بننے سے روکا جاتا۔ ایسے وقت میں علمائے ملت پر زبردست ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے آتش شوق جہاد بڑھانے کے لیے انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد جاری کیا اور میدان عمل میں آ گئے۔ تاہم انگریز چونکہ منظم انداز میں اور کافی تیاری کے بعد آگے بڑھے تھے۔ اس لیے تحریک آزادی ناکامی سے دوچار ہوئی۔ سقوط دہلی کے بعد مولانا فضل حق خیرآبادی لکھنؤ چلے گئے جہاں بیگم حضرت محل کی معیت میں جنگ آزادی کو کسی نہ کسی طور جاری رکھا جیسا کہ علامہ فضل حق پر قائم کردہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے:

''یہ بات ان ایام میں عام طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل) کے مشیران خاص ہیں۔

باغی فوج میں ان کی ''اربعہ شوریٰ'' کے نام سے شہرت تھی بلکہ کبھی کبھی انہیں 'کچہری پارلیمنٹ' کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔اس شوریٰ میں ملزم (علامہ فضل حق) بہت ممتاز تھا۔''(۳۲)

علامہ پر الزام قائم کیا گیا کہ انہوں نے بیگم حضرت محل کے مشیر ہونے کی حیثیت سے بوندی (لکھنؤ سے ملحقہ علاقہ) میں دو ایسے اشخاص کے قتل کا فتویٰ جاری کیا جو انگریز کے وفادار تھے۔ان اشخاص میں سے ایک نے بیان دیتے ہوئے کہا:

''مجھے موخاں اور مولوی فضل حق کے سامنے پیش کیا گیا، موخاں نے مولانا فضل حق سے دریافت کیا کہ میرے (عبدالحکیم) کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ مولانا نے فتویٰ کیا کہ یہ شخص فرنگیوں کا ملازم ہے اس لیے سزائے موت کا مستحق ہے۔(۳۳)

حالانکہ مولانا کے بقول صحیح صورتحال کچھ یوں تھی:

''میری چغلی ایسے مرتد، جھگڑالو، تندوخو افراد (عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین) نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے جس کا حکم یہ ہے کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے وہ دونوں نصاریٰ کی مودت ومحبت پر مصر تھے، انہوں نے مرتد ہوکر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔''(۳۴)

مولانا فضل حق خیرآبادی پر ۱۸۵۹ء میں مقدمہ بغاوت چلایا گیا۔انہوں نے جس جرأت صداقت وحقانیت اور بلند ہمتی سے اس مقدمہ کا سامنا کیا وہ بجائے خود ایک مثال ہے:

''۱۸۵۹ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتوے جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا ماخوذ ہوکر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔مقدمہ چلا، مولانا موصوف کے فیصلہ کے لیے جو جوڑی بیٹھی۔ایک افسر نے واقعات سن کر بالکل چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کیے اور پھر خود ہی مثال تار عنکبوت عقلی وقانونی ادلہ سے توڑ دیے۔جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔جج نے صدرالصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا۔وہ مولانا کی عظمت وتبحر سے بھی واقف تھا۔وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہوجائیں۔کرسکتا کیا کرے۔ظاہر یہ ہورہا تھا کہ مولانا بری ہوجائیں گے۔''(۳۵)

مولانا اپنے اوپر جتنے بھی الزامات تھے یکے بعد دیگرے سب رد کردیے۔جس مخبر نے فتویٰ کی اطلاع دی تھی اس کے بیان کی تصدیق وتوثیق بھی خود ہی کی:

''پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہوگیا اور جھوٹ بولا۔وہ فتویٰ صحیح ہے میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔''(۳۶)

حالانکہ صورتحال یہ تھی کہ جج بار بار انہیں روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔مخبر نے بھی عدالت کا رخ دیکھ کر مولانا کی شناخت سے گریز کرتے ہوئے کہہ دیا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں وہ دوسرے تھے۔مگر مولانا اپنی بات پر مصر رہے۔ان کے اقرار وتوثیق کے بعد کوئی گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔اس لیے انگریز عدالت نے انہیں حبس دوام بہ عبور دریائے شور (کالے پانی) کی سزا سنائی۔

چنانچہ مسٹر جان کیمبل، جوڈیشل کمشنر اودھ اور میجر بارو قائم مقام کمشنر خیرآباد نے ۳ مارچ ۱۸۵۹ کو فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا:

''بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ (مولانا فضل حق خیرآبادی) الور میں ملازم تھا، یہاں سے دیدہ دانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بہ قدم چلتا رہا ایسے شخص کو سخت ترین سزا

ملنا چاہیے اور اسے خاص طور پر ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے۔"(۳۷)

مولانا فضل حق اگر چاہتے تو مصلحت کوشی کا مظاہرہ کر کے صاف بچ سکتے تھے لیکن انہوں نے حق گوئی کو ہی طرۂ امتیاز بنایا حالانکہ فتویٰ پر جن دوسرے اصحاب نے دستخط کیے تھے وہ اپنے موقف سے ہٹ کر جان بچا گئے تھے۔ مثال کے طور پر مولانا کے رفیق خاص مفتی صدرالدین آزردہ صدر الصدور دہلی نے بھی ان کی خاطر فتویٰ پر "شہدت بالجبر" لکھ کر دستخط کر دیے تھے۔ گرفتاری کے بعد مفتی صاحب نے بتایا کہ میں نے تو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ جبراً دستخط کرا رہے ہیں(۳۸)۔ بالآخر مولانا فضل حق جزائر انڈیمان بھیج دیے گئے۔ ان کے جانے سے قبل وہاں مفتی عنایت احمد کاکوروی صدر امین بریلی وکول، مفتی مظہر کریم دریابادی اور کئی دوسرے علما پہنچ چکے تھے۔ انہی عاشقانِ پاک طینت کے وجود سے جزائر انڈیمان دارالعلوم میں تبدیل ہو گئے۔ ان حضرات نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں بھی قائم رکھا۔ ہر طرح کے مصائب کے باوجود علمی مشاغل جاری رہے۔ مفتی عنایت کاکوروی کی "علم الصیغہ"، "تواریخ حبیب اللہ"، "تقویم البلدان" (ترجمہ)، مفتی مظہر کریم کا "مراصد الاطلاع" کا ترجمہ (کمشنر جزائر انڈیمان میجر جان ہاٹن کی فرمائش پر) مولانا فضل حق کی "الثورۃ الہندیہ" اور "قصائد فتنۃ الہند" اسی دور کی چند اہم شاہکار کتابیں ہیں۔(۳۹)

علامہ فضل حق اور ان کے ساتھیوں کو کیا کیا تکالیف اٹھانا پڑیں اور انڈیمان میں انہیں کیسے کیسے ذلت آمیز حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ رسالہ و قصائد میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔(۴۰)

مولانا جزائر انڈیمان کی تکلیف دہ زندگی کے باوجود وہاں علمی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ جس کی نمایاں مثال ان کی مایۂ ناز تصنیف "الثورۃ الہندیہ" (یعنی باغی ہندوستان) ہے۔ ان کے تبحر علمی کے نہ صرف دوست بلکہ دشمن تک قدردان تھے۔ جس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ جزائر کا سپرنٹنڈنٹ مشرقی علوم سے واقف اور فن ہیئت کا ماہر ایک انگریز تھا۔ اس انگریز نے اپنی ایک فارسی کی کتاب ہیئت، وہاں قید ایک مولوی صاحب کو دی کہ اس کی عبادت کی تصحیح کر دیں۔ جب مولوی صاحب نے اس ضمن میں خود کو بے بس پایا تو مولانا فضل حق سے رجوع کیا اور مطلوبہ تصحیح کی گزارش کی۔ مولانا نے نہ صرف عبارت درست کی بلکہ مباحث میں بہت کچھ اضافہ کر کے حاشیہ پر بہت سی کتب کے حوالے لکھ دیے۔ انگریز مولوی صاحب کی کاوش پر حیران و ششدر رہ گیا اور مولوی صاحب کی لیاقت کی تعریف کی۔ مولوی صاحب نے حقائق چھپانے کے بجائے انگریز سے مولانا صاحب کا ذکر کیا۔ انگریز اسی وقت مولانا سے ملنے کے لیے ان کی کوٹھڑی میں آیا مگر آپ موجود نہ تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد مولانا کو ٹوکرا بغل میں دبائے آتے ہوئے دیکھا تو بہت افسوس کا اظہار کیا۔ مولانا سے معذرت کی اور انہیں کلرکی میں لے لیا۔ تاہم جزائر کے موسم اور تکالیف اور ناکافی خوراک و دیگر سہولیات کے فقدان نے مولانا کے قویٰ کو مضمحل کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا مسلسل بیمار رہنے لگے۔ مولانا صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بے خبر (میر منشی لیفٹیننٹ مغربی و شمالی صوبہ اودھ) ان کی رہائی کے لیے سرگرم تھے۔ لیکن جب وہ حکومت انگلشیہ سے رہائی کے احکامات لے کر جزائر پہنچے تو مولانا وفات (۱۸۶۱ء) پا چکے تھے اور ان کا جنازہ تیار تھا۔ اس طرح یہ آفتاب علم و عمل دیارِ غربت میں غروب ہو گیا۔ مولانا کو جزائر انڈیمان میں ہی دفن کر دیا گیا۔(۴۱)

مولانا پر انگریز مظالم کا سلسلہ ان کی ذات تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ ان کی آئندہ نسلوں کو بھی درست عبرت بنانے کی کوشش کی گئی۔ مولانا فضل حق کا شمار امراء و رؤسا میں ہوتا تھا۔ ان کی عمر قید و سزائے کالا پانی کے ساتھ ساتھ ان کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔ ان کا خیرآباد کا عالی شان دیوان خانہ محل سرا ضبط کر کے، خیر خواہی کے صلہ میں سردار محمد ہاشم سیتاپوری کو دے دیے گئے۔ جس نے اسے آگے رئیس کمال پور (ضلع سیتاپور) راجہ جواہر سنگھ کے ہاتھوں کوڑیوں کے مول بیچ ڈالے۔ علامہ کا کتب خانہ بھی ضبط کر لیا گیا۔(۴۲)

انگریز حکومت کی بے حسی دیکھیے کہ ۱۸۷۵ء میں اسی مولانا فضل حق خیرآبادی کے فرزند مولانا عبدالحق خیرآبادی کو حکومت برطانیہ نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر، اندھیر نگری چوپٹ راج کی مثال ملاحظہ فرمایئے کہ جب انگریز حکومت نے مولانا عبدالحق کو شمس العلماء کا خطاب دیا تو ساتھ میں مولانا فضل حق کی ضبط شدہ جائیداد میں سے کچھ دیہات بھی واپس کر دیئے۔ ان دنوں مولانا رام پور میں تھے۔ خیرآباد کے ایک باشندے یار علی نے علامہ فضل حق کا بیٹا بن کر وہ دیہات ہتھیا لیے اور بعد ازاں بیچ ڈالے۔ (۴۳)

علامہ فضل حق خیرآبادی نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے تین صاحبزادیاں سعید النساء، انجم النساء اور محمود النساء اور ایک صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی تھے جبکہ دوسری بیوی سے دو صاحبزادے مولوی شمس الحق اور مولوی علاء الحق تھے۔ جبکہ مولانا کی روحانی اولاد بلاشبہ ہزاروں میں تھی۔ جن میں ان کے فرزندوں کے علاوہ مولانا ہدایت اللہ خان جونپوری، مولانا فیض الحق سہارنپوری (استاد علامہ شبلی نعمانی)، مولانا سلطان احمد بریلوی، مولانا عبداللہ بلگرامی، مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا شاہ عبدالحق کانپوری، مولانا خیرالدین دہلوی (والد مولانا ابوالکلام آزاد) قابل ذکر ہیں۔ (۴۴)

مولانا فضل حق خیرآبادی ایک تبحر عالم دین، ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ و عمدہ ادبی ذوق کے بھی عالم تھے جس کا ایک عالم معترف تھا۔ سر سید احمد خاں کے بقول:

> ''جمیع علوم و فنون میں (مولانا فضل حق خیرآبادی) مدعائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انہیں کی فکر عالی نے بنیاد ڈالی ہے۔ علمائے عصر میں فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس گروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ اپنے آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا دعویٰ کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فرض سمجھے۔'' (۴۵)

مولانا فضل حق خیرآبادی معقول و منقول کے معتبر فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ باکمال شاعر بھی تھے۔ عربی میں کم و بیش چار ہزار اشعار آپ سے یادگار ہیں۔

مولانا محمد الدین فوقؔ کے بقول:

> ''قصائد غرا آپ کے امراء القیس اور لبید کے قصائد پر فوقیت رکھتے ہیں۔ نظم و نثر میں آپ کو اس قدر مہارت تھی کہ بلا مبالغہ شاید سلف و خلف میں چند آدمی آپ کے ہم پلہ ہوئے ہوں گے۔'' (۴۶)

اور یہ بھی حقیقت ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ مرزا غالب دہلوی جن کی نظر میں بڑے بڑے شعراء نہیں جچتے تھے، شعر و سخن میں مولانا فضل حق سے نہ صرف مشورہ کرتے تھے بلکہ ان کی اصلاح کو بھی قبول کرتے تھے۔ مولانا کے ایماء پر ہی غالب نے مشکل پسندی ترک کر دی تھی (۴۷)۔ انہوں نے غالب کی نہ صرف ادبی رہنمائی کی بلکہ اقتصادی مشکلات حل کرنے میں غالب کی حتی الوسع امداد کی۔ (۴۸)

سید سلیمان ندوی نے مولانا فضل حق خیرآبادی کو یوں خراج تحسین پیش کیا:

> ''مرحوم مولانا فضل امام کے جانشین صاحبزادے اور شاگرد مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔ جن کے دم عیسوی نے معقولات میں ایسی روح پھونکی کہ ابن سینائے وقت (بوعلی سینا) مشہور ہوئے۔ دیار و اطراف سے طلباء نے ان کی طرف رجوع کیا اور انہوں نے منطق و فلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا۔ غدر (جنگ آزادی) کے ہنگامہ میں فتویٰ جہاد کی پاداش میں گرفتار ہو کر جزیرہ انڈومان (کالا پانی) بھیجے گئے اور وہیں ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے تلامذہ اور در تلامذہ نے

سارے ملک میں پھیل کر علوم معقول کو بڑی رونق دی اور بڑے باکمال مدرس ثابت ہوئے۔" (۴۹)

علامہ فضل حق خیر آبادی کی بہت سی تصانیف ہیں جو ان کی کثیر المطالعگی اور تبحر علمی کی مظہر ہیں۔ ان میں سے چند مشہور حسب ذیل ہیں:

۱۔ الجنس الغالی شرح جواہر العالی۔
۲۔ حاشیہ افق المبین (علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ حاشیہ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے)
۳۔ حاشیہ تلخیص الشفاء
۴۔ حاشیہ شرح مسلم قاضی مبارک
۵۔ الہدیۃ السعیدیہ
۶۔ رسالہ تشکیک ماہیات
۷۔ رسالہ کلی طبعی
۸۔ رسالہ علم و معلوم
۹۔ الروض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود
۱۰۔ رسالہ قاطیغوریاس
۱۱۔ رسالہ تحقیق حقیقۃ الاسلام
۱۲۔ رسالہ ثورۃ الہندیہ
۱۳۔ قصائد فتنۃ الہند
۱۴۔ مجموعۃ القصائد
۱۵۔ امتناع النظیر
۱۶۔ تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ (۵۰)

مولانا فضل حق کی زندگی کو اگر ایک جملے میں سمیٹنا چاہیں تو تصویر کچھ یوں ملتی ہے کہ خیر آباد کے منطقی دبستان کے نمائندے، ادب شناس ادیب اور مجاہد جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ یہ اس دور کی جامعیت تھی کہ ایک عالم بے بدل اور دیندار منطقی اپنے مکتب و مدرسے سے ہٹ کر محفل شعر و سخن میں بھی اپنا لوہا منوا سکتا تھا۔ علامہ کو افسوس تاریخ میں وہ مقام نہ مل سکا، جو انگریز کے پروردہ ملاؤں کو دیا گیا۔ ان کا جرم صرف یہی تھا کہ وہ انگریز کو برصغیر سے نکال کر مسلمانوں کی کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیابی چاہتے تھے۔ مولانا خیر آبادی کے خلاف دشمن تو ایک طرف رہے خود دوستوں نے وہ سلوک کیا جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ انقلاب سن ستاون کے بعد کا ہندوستان سیاسی خلفشار کے علاوہ معاشرتی، اخلاقی، معاشی اور مذہبی افراتفری کا شکار رہا۔ مسلمانوں میں کتنی تحریکیں ابھریں اور بالآخر ختم ہو کر رہ گئیں۔ انگریز جب تک برسراقتدار رہا، تاریخ کے اوراق میں اس کے پروردہ لوگ ہی منظر پر رہے۔ مگر انگریز کے چلے جانے کے بعد جب گرد و غبار کے بادل چھٹے تو تاریخ کے منظر پر وہی اشخاص حق پرست جلوہ افروز ہونا شروع ہو گئے، جن کا اوراق تاریخ پر حق تھا۔ ان شخصیات میں مولانا فضل حق خیر آبادی پیش پیش تھے۔ مولانا صرف عالم دین ہی نہیں تھے بلکہ ایک مرد مجاہد ہونے کے ساتھ ساتھ دین و سیاست کا حسین امتزاج بھی تھے۔ جنہوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں عزم و عمل کا ایک ایسا کردار ادا کیا جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ محققین، مولانا فضل حق کی سوانح کے خفیہ گوشوں کو منظر عام پر لائیں۔ تاکہ جنگ آزادی کے اس عظیم ہیرو کو تاریخ میں شایان شان مقام مل سکے۔

حوالہ جات و تعلیقات

۱۔ سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد اگرچہ کئی حوالوں سے متنازعہ ہے اور مؤرخین اس پر انگریز کی حمایت کے بل بوتے پر چلائی جانے والی تحریک قرار دیتے ہیں۔ تاہم تحریک میں شامل علماء اور عوام الناس کی اسلام سے وابستگی کسی بھی قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ (رضوی، ڈاکٹر شاہد حسن، "شاہ ولی اللہ، مسلم تہذیب و اقتدار کا محافظ"، مشمولہ سہ ماہی التفسیر بہاولپور، شمارہ نمبر ۲، ۲۰۰۳ء، ص: ۱۹)

۲۔ قریشی، اشتیاق حسین، برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، کراچی، اشاعت دوم، ۱۹۸۳ء، ص: ۲۲۷

3- Sarkar, J.N., *Fall of the Mughal Empire*, Calcutta, 1949, p:49-50

4- Qureshi, Ishtiaq Hussain, *Histroy of the Freedom Movement*, Karachi, n.d., PP:267-68

۵۔ جعفری، رئیس احمد، بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ص: ۲۵۹۔۲۶۰

۶۔ نیازی، مولانا عبدالستار خان، ''مجاہد تحریک آزادی: علامہ فضل حق خیرآبادی''، مشمولہ ہفت روزہ الہام، بہاول پور، علامہ فضل حق خیرآبادی نمبر، اکتوبر، ۱۹۸۵ء، ص: ۸۲

۷۔ فاروقی، شاہ محی الدین، ''۱۸۵۷ء کے ایک نامور مجاہد''، مشمولہ ہفت روزہ الہام، محولہ بالا، ص: ۲۴

۸۔ ہفت روزہ الہام، بحوالہ سابقہ، ص: ۲۰۷

۹۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کی انگریز کی ملازمت چھوڑنے کی فوری وجہ ۱۸۵۵ء کا سانحہ ہنومان گڑھی مسجد بھی بنا۔ جب چند ہندو پنڈتوں نے مسلمانوں کو مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا اور انگریز نے مسلمانوں کے ردعمل کے خلاف توپخانہ کا بے دریغ استعمال کر کے بغاوت فرو کی۔ (انصاری، شاہد، ''تحریک آزادی میں علامہ فضل حق خیرآبادی کا کردار''، مشمولہ ہفت روزہ الہام، بحوالہ سابقہ، ص: ۱۹۸)

۱۰۔ عظیم، محمد، ''آسمان علم وفضل کا آفتاب درخشندہ، حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی''، مشمولہ ہفت روزہ الہام، بحوالہ سابقہ، ص: ۱۳۲

۱۱۔ قادری، محمد ایوب، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء: واقعات وشخصیات، پاک اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۶ء، ص: ۴۳۷

۱۲۔ واقعہ ہنومان گڑھی، مسلمان مجاہدین کی کفار کے ہاتھوں شہادت، قرآن کی بے حرمتی، واجد علی شاہ کی بے غیرتی اور غداری، اسلامی شعائر کی بربادی اور ناموس اسلام کی بے عزتی مولانا فضل حق کو گوارا نہ تھی، اسی لیے انہوں نے راجاؤں کے خطوط لکھ کر انہیں جہاد پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ راجہ الور سے بالمشافہ گفتگو کی مگر وہ تیار نہ ہوئے۔ پھر انہوں نے مولوی احمداللہ شاہ ولاور جنگ مدارس سے بھی ملاقات کی اور انہیں جہاد پر آمادہ کیا۔ اگست ۱۸۵۷ء میں الور سے دہلی پہنچے اور ۱۶ راگست کو بہادر شاہ ظفر سے بھی صورتحال پر تفصیلی گفتگو کی۔ بعد ازاں وہ جنرل بخت خان سے بھی ملے۔ (انصاری، شاہد، بحوالہ سابقہ، ص ص: ۱۹۸، ۱۹۹)

۱۳۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کی قلمی بیاض (عربی) ص: ۲۸، مملوکہ مولوی حکیم نصیرالدین ندوی، کراچی

۱۴۔ برکاتی، محمود احمد، ''مولانا فضل حق خیرآبادی''، مشمولہ ہفت روزہ الہام، بحوالہ سابقہ، ص: ۵۷

۱۵۔ قادری، محمد عبدالحکیم شرف، ''شہید تحریک آزادی: مولانا فضل حق خیرآبادی''، ہفت روزہ الہام، محولہ بالا، ص: ۷۸)

۱۶۔ ایضاً، ص: ۷۹

۱۷۔ قرآن حکیم، سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۵۱

۱۸۔ جعفری، رئیس احمد، بحوالہ سابقہ، ص: ۲۹۸

۱۹۔ انصاری، شاہد، بحوالہ سابقہ، ص ص: ۱۹۹، ۲۰۰ ۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ نظامی، اسد، ''مولانا خیرآبادی اور سن ستاون''، مشمولہ ہفت روزہ الہام، بحوالہ سابقہ، ص: ۱۴۲ ۲۲۔ ایضاً

23- Sherwani, Latif, *Pakistan in the Making*, Quaid-i-Azam Academy, 1987, pp: 4-6.

۲۴۔ انصاری، شاہد، بحوالہ سابقہ، ص ص: ۱۹۸۔۲۰۰ ۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ مولانا فضل حق خیرآبادی نے بیگم واجد علی شاہ حضرت محل کی ساتھ مل کر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ آپ نے لکھنو کے سب اعیان سلطنت کو نا اہل، سست، بزدل، احمق اور خائن ٹھہرایا۔ ان کے بقول ان میں سے اکثر ذلیل اور بعض بندگان زر تھے۔ وزیر موخاں اور راجا بلدیو سنگھ کو غدار اور انگریز کے ایجنٹ قرار دیا۔ (عبدالرشید، میاں، ''علامہ فضل حق خیرآبادی، علم و فضل کے بحر بیکراں''، مشمولہ ہفت روزہ الہام، بحوالہ سابقہ، ص: ۲۱۲

۲۷۔ ایضاً، ص ص: ۲۱۵

۲۸۔ خیرآبادی، مولانا محمد فضل حق، *الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان)*، مترجم عبدالشاہد خان شیروانی، مکتبہ قادریہ لاہور، ۱۹۷۴ء، ص: ۱۶۰

۲۹۔ ایضاً، ص ص: ۱۶۰، ۱۶۱

۳۰۔ جوشی، پی سی، انقلاب ۱۸۵۷ء، دہلی، ۱۹۷۲ء، ص: ۱۷۸

۳۱: خیرآبادی، بحوالہ سابقہ، ص: ۱۶۱

۳۲۔ ماہنامہ تحریک دہلی، جون ۱۹۶۰ء، ص: ۱۶ ۳۳۔ ایضاً ۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ خیرآبادی، بحوالہ سابقہ، ص ص: ۱۵۰۔۱۵۱

۳۶۔ نیازی، مولانا عبدالستار خان، بحوالہ سابقہ، ص: ۹۱

۳۷۔ ماہنامہ تحریک دہلی، بحوالہ سابقہ، ص: ۱۷

۳۸۔ نیازی، مولانا عبدالستار خان، بحوالہ سابقہ، ص ص: ۹۱، ۹۲

۳۹۔ خیرآبادی، بحوالہ سابقہ، ص: ۱۵۴

۴۰۔ ایضاً، ص: ۱۵۵ ۴۱۔ ایضاً، ص: ۱۵۶ ۴۲۔ ایضاً،

۴۳۔ ایضاً، ص ص: ۱۵۷، ۱۵۸

۴۴۔ فریدی، سید محمد جاوید امام، ''حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی''، مجاہد تحریک آزادی''، مشمولہ ہفت روزہ الہام، بحوالہ سابقہ، ص: ۱۵۸

۴۵۔ مقالات سرسید، حصہ شانزدہم، ص: ۳۴۸

۴۶۔ فوق، مولانا محمد الدین، روضۃ الادباء، ص: ۱۴۸، منقولہ بنی محمد عبدالحکیم شرف قادری، ''شہید تحریک آزادی: مولانا محمد فضل حق خیرآبادی''، ہفت روزہ الہام، بحوالہ سابقہ، ص: ۲۶

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ بریلوی، سید مصطفیٰ علی، ''علامہ فضل حق خیرآبادی''، مشمولہ ہفت روزہ الہام، بحوالہ سابقہ، ص: ۲۳

۴۹۔ ندوی، سید سلیمان، حیات شبلی، مطبوعہ معارف اعظم گڑھ، س ن، ص ص: ۲۲، ۲۳

۵۰۔ خیرآبادی، بحوالہ سابقہ، ص: ۱۰۷